قرونِ اولیٰ کے تشکیلی دور کے بعد کا اسلام

نظامِ تعلیم

ڈاکٹر فضل الرحمن

ہم نے اس سلسلۂ مضامین کی پچھلی قسط (ماھنامہ '' فکر و نظر '' بابت جولائی سنہ ۱۹۶۴ع) میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ راسخ العقیدہ گروہ نے فلسفہ اور علوم عقلیہ کے متعلق کیا روش اختیار کی - پچھلی بحث سے یہ بحث نکلتی ہے کہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اس کا ارتقاء کیونکر ہوا ؟ اس کی نوعیت اور ہیئت ترکیبی کیا تھی؟ چنانچہ ہمارے اس مضمون کا موضوع یہی نظام تعلیم ہے - لیکن ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کی نشو و نما کا تاریخی جائزہ یا ان اداروں کے درسی نصاب کا تفصیلی خاکہ پیش کریں - اس مضمون میں تو ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کا علم کا جو تصور ارتقا پاکر وجود میں آیا ، اس کی خصوصیات کا اجمالی خاکہ پیش کریں ، تاکہ اسلام کی تاریخ پر اس تصور کا اثر اور اسلام کے تاریخی عوامل کے خود اس تصور پر اثرات کے عمل اور رد عمل کی وضاحت ہوسکے -

قرآن حکیم نے اکثر مقامات پر ' العلم ' اور اس سے مشتق الفاظ کو عمومی اور جامع مفہوم میں استعمال کیا ہے : خواہ یہ علم کسی سے سیکھ کر ، یا اپنے غور و فکر کے ذریعہ ، یا تجربے سے ، یا کسی اور طریقے سے حاصل کیا جائے - قرآن حکیم کے ان شواھد سے یہ صاف ظاہر ہے کہ عہد رسالت میں یہ لفظ ان تمام وسیع مفہوموں میں مستعمل تھا - لیکن صحابہ کرام کے زمانے کے بعد اسلام نے روایت کی شکل اختیار کرلی - اور اس روایتی حیثیت میں وہ نشو و نما پانے لگا - چنانچہ بعد کے دور میں یہ اصطلاح محدود تر معنوں میں یعنی اس

علم کے لئے استعمال ہونے لگی، جو صرف کسی سے سیکھ کر حاصل کیا گیا ہو، خاصکر ان روایات کے حصول کے لئے یہ اصطلاح استعمال ہونے لگی جو قرن اول یعنی عہد رسالت و عہد صحابہ سے متعلق تھیں - اس روایتی ذخیرہ کو سمجھنے، ان پر غور و فکر اوران سے استنباط و استنتاج کے عمل کو ''فقہ'' کہا جانے لگا۔ اس لفظ کے لغوی معنی ہی ''سمجھنا'' ہیں - یہ بات خاصی معنی خیز ہے کہ ان ابتدائی ادوار میں جہاں ''علم'' اور ''فقہ'' کی اصطلاحیں تھیں، وہاں ان کے تقریباً عین متوازی ''حدیث'' اور ''سنت'' کی اصطلاحیں تھیں۔ ''حدیث'' روایات کا ذخیرہ تھی اور ''سنت'' ان روایات پر فکر و تدبر کرکے ان سے استنباط کئے ہوئے نتائج کا نام تھا (۱) - ہم اپنے پچھلے سلسلۂ مضامین میں حدیث و سنت پر تفصیلی بحث کرچکے ہیں اور بہ دلائل یہ واضح کرچکے ہیں کہ امت مسلمہ کے قرون اولی میں لفظ ''سنت'' کا اطلاق محض سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک محدود نہ تھا، بلکہ سنت نبوی سے عقلاً استنباط کئے ہوئے تمام فقہی نکات و نتائج بھی اس میں شامل تھے - ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پچھلی بحث کے بعد یہ نتیجۂ تحقیق اب مزید دلائل کا محتاج نہیں - تاہم یہ واضح کردینا خالی از فائدہ نہ ہوگا کہ سطور مندرجہ بالا میں جو امر واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ اس کی قوی ترین دلیلوں میں سے ہے -

یہاں ہم جس بنیادی حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرانی چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ:

> تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں ہی یعنی عہد رسالت کے گذرجانے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ''علم'' کے مفہوم میں عقلی کی جگہ روایتی رجحان غالب آگیا تھا -

''اطلبوا العلم'' کے مشہور قول میں ''العلم'' کا عہد رسالت کے بعد کا یہی مفہوم پایا جاتا ہے: یعنی روایات سلف، بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال کے بارے میں جو روایتیں مشہور تھیں، ان کا علم - یہ ضرور ہے کہ بعد کے ادوار، خاصکر موجودہ دور، میں ''العلم'' اور ''طلب العلم''

کے مفہوم میں دوبارہ وسعت پیدا کرلی گئی ہے - لیکن اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ تاریخی طور پر حقیقت یہ ہے کہ " طلب العلم " کی اصطلاح راویوں اور محدثوں کے حلقوں میں وضع ہوئی اور ایک خاص مفہوم میں برتی گئی، یعنی 'شدالرحال ' ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا طول طویل سفر طے کرنا اور اس کے شدائد برداشت کرنا، تاکہ روایات کے ماہر اساتذہ (حفاظ حدیث) کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا جائے اور ان کے ذخیرۂ روایات سے فیض اٹھایا جائے - بعد کے زمانے میں اور رواۃ حدیث کے علاوہ دوسرے حلقوں میں " العلم " کی اصطلاح کا اطلاق وسیع تر مفہوموں میں ہونے لگا : مثلاً مشہور مقولہ -

العلم علمان : علم الادیان وعلم الابدان (۲)

(" علم تو بس دو طرح کے ہیں: مذہبی امور کا علم اور انسانی اجسام کا علم، یعنی علم طب - ")

رہی اصطلاح " فقہ " تو جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، شروع کے زمانے میں اس کا اطلاق فکر وفہم کے ایک خاص طریق، خاص عمل پر ہوتا رہا لیکن بعد میں جب قانونی نظام مدون ہونے لگا، تو اس اصطلاح کا اطلاق قانونی نظام پر بھی ہونے لگا، بلکہ اب قانونی مسائل کے فہم و تدبر کے عمل کے لئے کمتر اور اس عمل کے نتیجے کے طور پر مدونہ قوانین کے مجموعے کے لئے بیشتر یہ لفظ استعمال ہونے لگا - اس سے بھی بعد کے دور، یعنی تقریباً چوتھی صدی ہجری کے بعد کے زمانے میں اس لفظ کا فہم و فکر کے مفہوم سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا - بلکہ یہ تو اب شجر ممنوعہ قرار پایا - اس اصطلاح کے معنی اب محض یہ رہ گئے کہ قرون اولیٰ کے ائمہ کے مدون کئے ہوئے قانون کے علم کا مجموعہ - کچھ شواہد اس امر کے بھی موجود ہیں کہ جب علم کلام کی بنیاد پڑی، تو اسے فقہ سے ممتاز کرنے کے لئے " علم " کی اصطلاح بعض دفعہ علم کلام ہی کے لئے مختص کردی گئی - غرض، ان اصطلاحوں کے جو مفہوم شروع میں متعین کئے گئے تھے، بعد میں وہ تقریباً بالکل الٹ گئے - گرچہ یہ تبدیلی مستقل نہیں ثابت ہوئی -

قرون اولیٰ میں راسخ العقیدہ مسلمانوں نے اعلیٰ تعلیم کا کوئی باقاعدہ نظام نہیں ترتیب دیا تھا ۔ ان کی درس گاہیں محض ابتدائی درجے کی تھیں ۔ جن میں بچوں کو قرآن مجید، نوشت و خواند، اور ساتھ ھی ساتھ اکثر حساب کی مبادیات کی تعلیم دی جاتی تھی ۔ اعلیٰ تعلیم کا محور اس زمانے میں درس گاھیں نہیں بلکہ ذی علم شخصیتیں تھیں ۔ طالب علم ایک مشہور و معروف شیخ سے کسب فیض کر کے دوسرے شیخ کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے اور ان سے سندیں حاصل کرتے تھے ۔ سارے کے سارے درسی مضامین روایتی نوعیت کے ھوتے تھے ۔ تنظیم کے فقدان کی وجہ سے ابتدائی مدارج سے اعلیٰ مدارج تک طالب علموں کے پہنچنے کا کوئی انتظام نہ تھا ۔ یہ دونوں مدارج بالکل جداگانہ تھے ۔ بلکہ انھیں ''مدارج'' کہنا بھی درست نہیں، کیونکہ ''درجہ بندی'' کا اس وقت کوئی تصور نہ تھا ۔ بعد میں جب اعلیٰ علوم کے لئے پہلا اھم ادارہ بغداد میں خلیفہ مامون کے حکم سے قائم ھوا، جو تاریخ میں ''بیت الحکمۃ'' کے نام سے مشہور ھے، تو اس پر معتزلی عقلیت پسندوں نے قبضہ کرلیا اور حقیقت تو یہ ھے کہ یہ ادارہ راسخ العقیدہ گروہ کے خلاف تشدد کا ایک آلہ بن گیا ۔ اسی طرح اھل تشیع نے اپنے عقائد کی تبلیغ کے لئے منظم کوششیں کیں اور اس مقصد کے لئے درس گاھیں قائم کیں، جن میں سب سے زیادہ شہرت جامعہ ازھر کو حاصل ھوئی، جسے مصر کے فاطمیوں نے قائم کیا تھا اور جس پر راسخ العقیدہ گروہ کا تسلط اس وقت ھوا جب ایوبیوں نے فاطمیوں کا اقتدار ختم کردیا ۔ ان تجربوں سے راسخ العقیدہ علماء نے درس عبرت حاصل کیا اور مسلمانوں کے ان مختلف الخیال گروھوں کی تعلیمی تنظیم کی کوششوں نے انھیں للکارا تو انھوں نے بھی تعلیم کی تنظیم و تنسیق کے لئے کمر ھمت باندھی ۔ راسخ العقیدہ گروہ کی پہلی عظیم درس گاہ صحیح معنوں میں وہ تھی جسے پانچویں صدی ھجری (گیارھویں صدی عیسوی) میں سلجوق وزیر نظام الملک نے قائم کیا تھا ۔ اور جس میں حجۃ الاسلام امام غزالی رح نے بھی درس دیا تھا ۔ لیکن یہی وہ زمانہ تھا جب کہ اسلام کی علمی دنیا میں فلسفہ کی وہ تحریک نمودار ھوئی، جس پر ھم اس سلسلہ مضامین کی پچھلی قسط میں بحث کرچکے ھیں ۔ یہ فلسفی، جو ساتھ ھی ساتھ

اپنے وقت کے سائنس دان اور سائنسی مفکر بھی تھے، راسخ العقیدہ علماء کا ہدف ملامت بن گئے - چنانچہ ثبوتی (یعنی واقعات و مشاهدات پر مبنی) علوم کے بارے میں راسخ العقیدہ گروہ کا رجحان مجموعی طور پر انتہائی غیر صحت مندانہ هوگیا - اس طرح علماء نے اپنے ورثہ علمی کو تو یقیناً محفوظ رکھ لیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا یہ ورثہ اپنے بنیادی نظام فکر کے لحاظ سے اسلام کے مطابق ہے - لیکن اس تحفظ کے لئے انہیں بڑی مہنگی قیمت دینی پڑی : راسخ العقیدہ گروہ کا نظام تعلیم اور ان کا نظام فکر محض مردہ کا ورثہ بن گیا - ان میں زندگی کی حرارت باقی نہیں رہی - حقیقت یہ ہے کہ کسی نظام فکر کا بار آور و بر و مند هونا تو درکنار، اس کا ایک عرصے تک قائم رہ جانا اور مرجع احترام رهنا بھی اس امر پر منحصر ہے کہ وہ ثبوتی (Positive) و تجرباتی (Scientific) فکر کی زندہ و نمو پذیر رو سے برابر اثر قبول کرتا اور اس پر اثر انداز هوتا رہے - یہ سوچنا کہ آزاد ثبوتی فکر کا گلا گھونٹ کر مذہب کا تحفظ کیا جاسکتا ہے، محض خود فریبی ہے - اس کا نتیجہ اس کے برعکس یہ هوتا ہے کہ خود مذہب کے نشو و نما اور بقا کے سوتے خشک هوجاتے هیں - چنانچہ اسلام کے ساتھ بھی یہی گزری - چند صدیوں کے بعد هی اسلام کا '' تاریک دور '' شروع هوگیا - مسلمہ عقائد کے حامیوں کے پاس اسلام ضرور بچ رہا - مگر کس حال میں ؟ محض پوست ، مغز سے محروم - ایک ظاهری رسمی ڈھانچہ، روح سے عاری -

امام غزالی رح المنقذ من الضلال میں لکھتے هیں کہ فلاسفہ کے علوم میں ریاضی و طبیعیات (Physics) جیسے علوم بھی داخل هیں (جنھیں موجودہ اصطلاح میں سائنسی علوم کہا جائے گا) ، لیکن چونکہ فلاسفہ کے بعض نظریات مذہب کے معارض هیں، اس لئے اسلام کے کچھ نادان دوست ریاضی اور طبیعیات کے بھی مخالف هیں اور ان علوم کی بدیہیات سے بھی انکار کربیٹھتے هیں - امام غزالی رح کے نزدیک یہ ایک '' آفت '' ہے - انہوں نے ان عقل دشمن، جہل پرور '' محبان '' اسلام کو اسلام کا دشمن قرار دیا ہے (۳) ان کا یہ فیصلہ ان کی روشن بصیرت اور قوی حس تمیز کی دلیل ہے - لیکن اسی دلیل سے انہوں نے اس کے متضاد نوعیت کی '' آفت '' کا سدباب کرنے کی

کوشش کی ہے - وہ لکھتے ہیں کہ چونکہ ریاضی جیسے علوم فلاسفہ دقیق مسائل اور واضح دلائل پر مشتمل ہیں، اس لئے ان کی وجہ سے لوگوں کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہوجاتا ہے کہ تمام علوم فلسفہ ایسے ہی حقائق ثابتہ کے حامل ہیں، چنانچہ وہ فلسفیوں کے تمام ہی نظریات پر ایمان لے آتے ہیں (۴) - امام غزالی رح کا یہ بیان سراسر حق پر مبنی ہے - لیکن اس سے جو نتیجہ انھوں نے اخذ کیا وہ مسلمانوں کی علمی زندگی کے لئے مہلک ثابت ہوا - اس '' آفت '' سے بچنے کے لئے انھوں نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ جو ریاضی جیسے علوم میں غور و خوض کرتا ہے، وہ بھی زجر و توبیخ کا سزاوار ہے (۵) - راسخ العقیدہ گروہ کی طرف سے ثبوتی علوم کے خلاف یہ پہلا واضح اور باقاعدہ اعلان جہاد تھا، جس کی صدائے باز گشت بعد کی تمام صدیوں میں سنی جاتی رہی - لیکن اس جہاد کی زد میں صرف ثبوتی علوم ہی نہیں آئے، بلکہ بالآخر خود راسخ العقیدہ گروہ کی اپنی علمی زندگی پر بھی ضرب کاری لگی -

آٹھوین صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) کے طبّاع فقیہ، امام شاطبی رح نے اپنی کتاب الموافقات میں یہ بنیادی '' مقدمہ '' قائم کیا ہے کہ فلسفہ جیسے خالص عقلی علوم کا سیکھنا سکھانا جائز نہیں، کیونکہ ان علوم کا '' عمل '' سے کوئی تعلق نہیں - اور صرف وہی علوم لائق تحصیل ہیں جو '' عمل '' کے لئے ضروری ہیں - امام شاطبی رح معترض کی اس دلیل کو رد کردیتے ہیں کہ علوم عقلیہ کے ذریعہ فکر کی جلا ضروری ہے، اس لئے کہ آخرکار فکر خالص عمل انسانی کے مقاصد کی تشکیل پر اثر انداز ہوتی ہے - (٦) وہ واشگاف لفظوں میں اعلان کرتے ہیں کہ عقل ہرگز شارع نہیں- بلکہ اخلاقی اوامر و نواہی کی تشکیل میں بھی عقل کا عمل دخل نہیں ہے(۷)- ان کے نزدیک اسلامی شریعت کی حقیقت یہ ہے کہ یہ امّی امت کے لئے امّی شریعت ہے (۸) - دلچسپ بات یہ ہے کہ عقل سے اس انکار کے باوجود امام شاطبی رح نے '' اغراض شریعت '' کے تعین میں بڑے عقلی استدلال سے کام لیا ہے -

امام ابن تیمیہ رحہ نے فلسفہ اور عقلیت کے خلاف جس شدت سے اپنی مخالفت کا اظہار کیا ہے، وہ اس قدر معروف ہے کہ یہاں اس کے بیان کی حاجت نہیں -

سترھویں صدی عیسوی کے اہم مصلح و مجدد اور بدیع الخیال مفکر شیخ احمد سرھندی رحہ کے کارنامے کا ذکر ہم اس سلسلہ' مضامین کی پچھلی قسط میں کرچکے ہیں (۹) - یہ بھی فلسفہ و طبیعیات و ریاضی کے سراسر مخالف تھے - فلسفے کا وہ مذاق اڑاتے ہی ہیں - علم حساب کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ اس میں وقت لگانا تضییع اوقات ہے - صرف اتنا حساب آنا چاھئے کہ علم الفرائض (یعنی تقسیم میراث) اور قبلے کا رخ معلوم کرلنے میں کام آسکے - علم ھندسہ (Geometry) ان کے نزدیک " محض لا یعنی اور بے ھودہ اور لا طائل " ہے- "بھلا مثلث کے تین زاویوں کا دو زاویہ قائمہ کے برابر ھونا کس کام آئے گا ؟ " (۱۰) -

الغرض، ریاضی اور طبیعیات جیسے ثبوتی، سائنسی علوم کے خلاف فتوی پر جن جن مشاھیر اسلام کی مہریں لگی ھیں، ان کی طویل فہرست میں سے ہم نے یہاں صرف چند نام گنائے ھیں، لیکن ہم سمجھتے ھیں کہ مثال کے لئے یہی بہت کافی ھیں - یہ سب کی سب عظیم شخصیتیں تھیں - اسلام کی روحانی تاریخ میں انہوں نے مستقل ابواب کا اضافہ کیا ہے، جن کے لئے وہ ھمارے بڑے سے بڑے خراج تحسین کے مستحق ھیں - لیکن ثبوتی، سائنسی علوم کے بارے میں ان کا جو رویہ تھا، اس کے بیان کے لئے صرف ایک ھی موزوں لفظ ہے : 'مہلک' - انہوں نے مسلم فلسفیوں پر جو تنقید کی اور مسلمانوں میں عقلیت نے جو واقعی اثرات و نتائج پیدا کئے، ان کی تنقیص میں انہوں نے جو کچھ لکھا اس سے ھر سلیم الطبع انسان اتفاق کریگا - ہم نے خود ان مقامات کی نشاندھی کی ہے جہاں فلسفہ حد اعتدال سے متجاوز ھوگئے تھے- لیکن جب مسلمہ تقائد کے حامیوں نے، پشت در پشت و پے بہ پے، انسانی عقل کو ھی ساقط الاعتبار قرار دیا تو یہ انتہا پسندانہ اور چو طرفہ حملہ نہ صرف غیر صحتمندانہ بلکہ خودکشی کے مترادف تھا - انسان کی آزادی' فکر میں

بالذات کچھ ایسے عناصر پنہاں ہیں، جن کے باعث وہ لازماً حد اعتدال سے متجاوز ہوجاتی ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی کا خاصہ ہی یہ ہے۔ لیکن اس کا علاج یہ نہیں کہ آزادی فکر کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ بلکہ یہ ہے کہ اس پر جرح و تنقید کا عمل مسلسل جاری رہے۔ عقلیت اتنی نازک شے ہے کہ قید و بند اس کے لئے پیام موت ہیں۔ بہ الفاظ دیگر ''فکر آزاد'' اور ''فکر'' میں بہ لحاظ معنی کوئی فرق نہیں۔ فکر کی آزادی سلب کرلینے کے بعد یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ اس کی زندگی قائم رہے گی۔ مختصر یہ کہ اس شعبے میں بھی اسلام پر وہی گزری جو دیگر شعبہ ہائے حیات میں اس پر گزرتی رہی ہے اور جس کا ذکر ہم اپنے پچھلے مقالات میں کئی بار کرچکے ہیں، یعنی یہ کہ:

> اسلام غلو (انتہا پسندی) کے دو پاٹوں میں پس گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قانون مبرم تھا، جو راسخ العقیدہ گروہ کو اس بات پر مجبور کررہا تھا کہ وہ ثبوتی (سائنسی) فکر کو نیست و نابود کردے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شرعی اور غیر شرعی علوم ''دینی'' اور ''دنیوی'' شعبہ ہائے علم کے مابین ایک آہنی دیوار کھڑی کردی گئی، جس سے مسلمانوں کی تعلیم اور فکر کی کیفیت اور معیار کو بے انداز نقصان اور زوال پہنچا۔

علم اور فکر کی صحت مندانہ نشو و نما کے لئے علم کی کلّی وحدت کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ (موجودہ زمانے میں بھی، جب کہ علوم میں اختصاصی مہارت کا حصول ضروری قرار دے دیا گیا ہے، یہ خطرہ کسی حد تک موجود ہے۔ اگرچہ اس کا سدباب کرنے میں ایسی جامع شخصیتوں کی موجودگی ممد و معاون ہے جو اپنے مخصوص شعبۂ علم میں ماہرانہ کمال رکھنے کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی مفکرانہ صلاحیت بھی رکھتے ہیں) - ریاضیاتی، طبیعی (سائنسی) اور عقلی علوم کے کامیاب اخراج کے بعد علماء نے اپنے علم کلام و عقائد میں فلسفہ اور بالخصوص منطق کے بعض عناصر کو تمہیدی علوم یا علوم آلیہ کی حیثیت سے جگہ دی۔ ایسے فلسفیانہ نظریات کا مقابلہ کرنے کی غرض سے جن سے مذہب پر زد پڑسکتی تھی، علم کلام کو اس طور پر مزید

وسعت دی گئی کہ اس میں نبوت ، حشر اجساد اور تخلیق وغیرہ مسائل سے متعلق رسمی مباحث شامل کرلئے گئے - اس کے بعد ھی سے جزو لا یتجزاء (Atomism) کے نظریہ کو علم طبیعیات کا جزو لازمی بنالیا گیا - کیونکہ ان متکلمین کا یہ خیال تھا کہ اس نظریے کی موجودگی میں علت و معلول (Causation) کے قانون کی ضرورت باقی نہیں رھتی اور ھر واقعے میں قضا و قدر کے دخل کی راہ ھموار ھوجاتی ھے- شہرستانی نے جو فلسفے پر امام غزالیؒ کی تنقید کے بعد کلامی دینیات کا پہلا باقاعدہ عالم تھا ، اس کا وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ھے -

جیسا کہ ھم نے اس سلسلہ مضامین کی پچھلی قسط میں بتایا ھے ، جب فلسفہ پر راسخ العقیدہ علماء کی ھر طرف سے یورش ھوئی تو فلسفیوں نے بھیس بدل لیا - فلسفہ الٰہیات کا بڑا حصہ متصوفانہ نظریات کی شکل میں نمودار ھوا - فلسفہ پر عقل کی عائد کردہ جو بندشیں تھیں وہ بھی اب باقی نہیں رھیں - یہاں یہ بات قابل غور ھے کہ بحیثیت مجموعی ارباب تصوف تعلیم کے سخت مخالف تھے - چنانچہ انہوں نے عوام میں اپنے وسیع اثر کو علمی و ذھنی تربیت سے ھٹا کر روحانی تزکیہ کے طریقے پر ڈال دیا - اگر یہ انداز فکر و طریق عمل معدودے چند ''خواص'' تک محدود رھے تو شاید ضرر رساں نہ ھو ، لیکن یہاں تو بارھویں صدی عیسوی سے تصوف نے عوامی تحریک کی شکل اختیار کرلی تھی' چنانچہ اس رجحان کے اثرات اسلام کی ذھنی زندگی کے لئے بے حد تباہ کن ثابت ھوئے - بارھویں صدی عیسوی سے مسلمانوں کے بہترین تخلیقی صلاحیت رکھنے والے ذھین ترین افراد راسخ العقیدہ گروہ کے مدرسوں سے نکل نکلکر صوفیاء کی خانقاھوں کا رخ کرتے رھے ھیں - صوفیاء کا کوئی تذکرہ اٹھاکر دیکھ لیجئے - آپ کو معلوم ھوگا کہ کتنی کثیر تعداد میں لوگ ''علوم ظاھری و رسمی'' کو چھوڑکر صوفی سلسلوں میں شامل ھوتے رھے ھیں - ملت کے بہترین افراد علماء کی صفوں سے خارج ھوتے رھے اور ان سے کٹ کر ایسی راہ پر پڑگئے جو فکری لحاظ سے اسلام کے لئے معتزلہ یا فلاسفہ کے مسلکوں سے کہیں زیادہ خطرناک ھے - یوں علماءؔ کا

نظام تعلیم ایک بے جان ڈھانچہ رہ گیا، زندگی کی چہل پہل خانقاہوں اور تکیوں کے حصے میں آگئی -

ان حالات میں مدرسوں نے دینی نظم و نظام کو باقی رکھنے کے کام پر اپنی ساری توجہ مرتکز کردی اور دینی نظام کی حفاظت کی واحد پناہ گاہیں یہی مدارس تھے - لیکن سنیوں اور شیعوں دونوں کے عقائد کے نظام میں بعض عجیب و غریب بنیادی تناقضات رہ گئے ہیں، جو صرف اسی صورت میں رفع ہوسکتے تھے، جب کہ تنقیدی اور تعمیری آزاد خیالی کے ذریعہ ان نظامات کو ارتقا کا موقع ملتا- چنانچہ ایک اہم مسئلے میں اہل السنت کے ہاں جو تناقض پایا جاتا ہے، اس کی نشان دہی خود امام ابن تیمیہ رح نے کی ہے : اہل السنت کے علم کلام میں جبر کا جو عقیدہ موجود ہے، اس پر اعتراضات وارد کرتے ہوئے امام بن تیمیہ رح اس تضاد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جب یہ متکلموں کے ساتھ بحث کرتے ہیں جو قدر کے قائل ہیں تو یہ ان کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ,, انسانی استطاعت تو محض فعل کے سر زد ہونے تک ہے - (ان الاستطاعة لا تکون الامع الفعل) یعنی ان کے نزدیک انسان کے اپنے ارادے کا دخل نہیں ہوتا - لیکن قاضی یا مفتی کی حیثیت سے جب یہی فقہی مسائل میں غور و خوض کرتے ہیں تو مذکورہ بالا موقف کے بالکل برعکس وہ انسان کی استطاعت متقدمہ کے قائل ہوجاتے ہیں جو مناط امرونہی ہے -(اثبتوا الاستطاعة المتقدمة التی ہی مناط الامرو النہی) یعنی اب وہ انسانی ارادے کے آزاد اور مؤثر ہونے کے قائل ہوجاتے ہیں - (۱۱) یہ ایک بنیادی تناقض ہے، لیکن اس کے باوجود فرض یہ کیا جاتا ہے علم کلام رئیس العلوم الشرعیہ ہے - اس کے لئے دعویٰ یہ ہے کہ اسی پر تمام علوم شرعیہ کی بنیاد ہے اور یہی تمام شرعی (فقہی) اخذو استنباط مسائل کی تاویلات کا ماخذ و مرجع ہے (یبنی علیہ العلوم الشرعیہ فانہ اساسہا والیہ یؤل اخذہا و اقتباسہا) (۱۲) عقائد کے نظام میں ایسے تناقضات کے راہ پا جانے کی وجہ یہ ہے کہ عقلیت سے گریز کیا گیا اور اسے اس نظام کے مزاج میں داخل نہیں ہونے دیا گیا اور علوم عقلیہ کو حقیر و ناقابل التفات سمجھا گیا-

دلیل یہ تھی کہ یہ عقلی علوم غیر شرعی ہیں اور علم کلام سب سے اعلیٰ علم شرعی ہے تو اس کا ان غیر شرعی علوم کا محتاج ہونا ناقابل تصور ہے - (احتیاجه الی مالیس علما شرعیا مع کونه اعلی منه ممایستنکر) (۱۳)- شیعی نظام عقائد میں تو اس سے بھی زیادہ شدید تناقضات پائے جاتے ہیں - حق و انصاف کا تقاضا ہے کہ اس بات کا اعتراف کیا جائے کہ بہت سے معاملات میں شیعی فقہ میں اہل السنت کے بعض فقہی مذاہب کی نسبت " نیت " کی اہمیت پر زیادہ زور دیا گیا ہے ' جس کی وجہ یہ ہے کہ شیعی کلام کی رو سے انسانی ارادہ مختار ہے - لیکن یہاں دو باتیں خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہیں : اولا ' امام معصوم کے عقیدے کے ہوتے ہوئے ذہن انسانی ، ضمیر انسانی اور ارادہٗ کی کیا قدر و قیمت رہ جاتی ہے ؟ سچ پوچھئے تو امام معصوم کے تصور کو انسان نہیں' کٹھ پتلیاں درکار ہیں جو امام معصوم کے اشاروں پر چلیں - ثانیاً شیعی عقائد میں انسانی ارادہ کے مختار ہونے پر جو زور ہے ' اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ شیعی فقہ کے اصول اور مقدمات ' اہل السنت کے فقہی اصول و مقدمات سے مختلف ہوتے' لیکن ایسا نہیں ہے - بحیثیت مجموعی شیعی اور سنی فقہ میں چند فروعات کو چھوڑ کر اصلاً کوئی فرق نہیں ہے - واقعہ تو یہ ہے کہ اسلام کی مذہبی تاریخ میں یہ عجیب بات نظر آتی ہے کہ معتزلہ ' جو اخلاقی حسن و قبح کے تصور کی بنیاد براہ راست عقل پر رکھتے تھے ' وہ بھی فقہی تدوین میں امت کے دوسرے علماء سے مختلف نہیں ہیں - حالانکہ فقہ یا قانون کی اصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ یہ اخلاقی اصول کو معاشرے میں برتنے کی تدبیر ہے - واضح ہو کہ معتزلہ کا اخلاقیات کے بارے میں جو موقف تھا ، ہم اس کے حامی ہرگز نہیں - ہم نے اس کا ذکر یہاں اس لئے کیا ہے کہ بنیادی تناقضات کی چند مثالیں دیں اور ان کے ذریعہ اصل مسئلے کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کریں - ان تمام تناقضات کے ضمن میں ہمارا موقف یہ ہے کہ

> اخلاقی حسن و قبح اور فقہی اوامر و نواہی دونوں کے استنباط کے لئے لائق اعتماد طریقہ صرف یہ ہے کہ قرآن و سنت کی عقلی تعبیر کی جائے -

ہم نے صفحات بالا میں مختصراً یہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیا علوم پڑھائے جاتے رہے ہیں اور ان علوم میں کیا کچھ تھا۔ اب یہ بھی دیکھنا چاہئیے کہ یہ علوم پڑھائے کس طرح جاتے تھے - یہ دوسرا سوال پہلے سے کسی طرح کم اہم نہیں ہے - یہاں ہم یہ پاتے ہیں کہ سارا زور علوم یا ان کے موضوعات کی تحصیل پر نہیں بلکہ کتابوں کی تدریس پر صرف کیا جاتا تھا - مثلاً طالب علم فقہ کی تعلیم نہیں حاصل کرتا تھا - وہ تو کنزالدقائق یا ہدایہ کا درس لیتا تھا - وہ تفسیر کا علم نہیں حاصل کرتا تھا بلکہ جلالین یا بیضاوی پڑھتا تھا، بلکہ ان کا ''دورہ'' کرتا تھا - اس تعلیمی نظام کے پیدا کردہ ماحول کی ذہنی سطح کے لئے یہ طریقۂ تعلیم حسب حال ضرور تھا - لیکن اس سے علوم کے سمجھنے، ان کی تنقید اور تجزیہ کرنے کی صلاحیتیں نہیں ابھر سکتی ہیں - بلکہ اس سے تو محض چند کتابوں کے رٹ لینے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے - جس کی مذمت کرتے ہوئے قرآن نے یحمل اسفارا (''چند موٹی کتابوں کے ڈھوئے پھرنے'') کا بلیغ طنز استعمال کیا ہے۔ اس طریقۂ تعلیم کی اور خاص کر اس کے موضوعات کی، بعض ممتاز شخصیتوں نے تنقید (۴۱) لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا - یہ ضرور ہے کہ اسلامی تاریخ میں بدیع الخیال مفکر اور ایسے بلند پایہ اور طباع انسان ہر دور میں، یہاں تک کہ دور متاخرین میں بھی، پیدا ہوتے رہے ہیں جنہیں عبقری (Genius) کہہ سکتے ہیں - لیکن ایک تو ایسے باکمالوں کی تعداد بہت ہی تھوڑی ہے - دوسرے، یہ اپنی پیدائشی خداداد صلاحیتوں کے بل پر ابھرے، ان کی تخلیق میں مدرسہ کے نظام کا کوئی ہاتھ نہ تھا - اس کا مطلب یہ نہیں کہ اچھے نظام تعلیم سے ہمیشہ عبقری قسم کے انسان پیدا ہوتے ہیں - ایسے انسان تو ہر زمانے اور ہر تمدن میں شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں - لیکن اچھے نظام تعلیم کا کام یہ ضرور ہے کہ وہ معاشرے کے اوسط ذہنی معیار اور اس کی سطح کو اتنا اونچا رکھے کہ اوسط درجے کا ذہن رکھنے والے افراد کی بہترین صلاحیتیں ابھریں اور غیر معمولی ذہنی صلاحیت والے فرد کو اپنی ذہنی پرواز کے لئے وسیع طیران گاہ مل جائے - لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارے نظام تعلیم نے ان دونوں میں سے کسی تقاضے کو پورا نہیں کیا - اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض مستشرقوں کو یہ سوال اٹھانے کا موقع مل گیا کہ کہیں ایسا

تو نہیں کہ اسلام اور ذہنی فرومایگی لازم و ملزوم ہیں - بعض زیادہ کٹر قسم کے مغربیوں نے تو اس سوال کا جواب اثبات میں دے ڈالا ہے - اغیار کے ان طعنوں کے لئے قصور وار ہمارا نظام تعلیم ہے -

حواشی

(۱) حدیث اور سنت کی تفریق کی دو مثالیں یہ ہیں :-

عبدالرحمن بن مہدی (متوفی سنہ ۱۹۸ ھ) کے بارےمیں روایت ہے کہ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ سفیان ثوری حدیث کے امام ہیں ' سنت کے امام نہیں ہیں جب کہ اوزاعی ان کے برعکس سنت کے امام ہیں حدیث کے امام نہیں ہیں - البتہ مالک حدیث اور سنت دونوں کے امام ہیں - (شرح الزرقانی علی موطا الامام مالک' مصر' سنہ ۱۹۵۴ م' ج ۱ ص ۲) -

حالت احرام میں وفات پانے والے کی تجویز و تکفین کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباس رض کی حدیث روایت کرنے کے بعد ابو داؤد امام احمد بن حنبل کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ " فی ہذا الحدیث خمس سنن " یعنی " اس حدیث میں پانچ سنتیں ہیں " - (سنن ابی داؤد' کتاب الجنائز کا آخری باب -)

گولڈ زیہر نے اپنے مقالے میں ان دونوں مثالوں کا حوالہ دیا ہے - ملاحظہ ہو اس کی کتاب (Muhammadanlche Studien)' طبع ثانی' سنہ ۱۹۶۱ء' ص ۱۱' حاشیہ ۶ اور ص ۱۲ -

(۲) اس مقولے میں " اجسام " کی جگہ " ابدان " کے طبی اصطلاحی معنے میں مستعمل ہونے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مقولہ علم طب کے رائج ہونے کے بعد کا ہے - دوسرے علوم کو چھوڑ کر محض علم طب کے ذکر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ افادیت کا پہلو کس قدر غالب تھا -

(۳) المنقذ من الضلال' تعلیق و تصحیح محمد جابر' مکتبہ الجندی' قاہرہ' تاریخ ندارد، ص ۲۵ -

(۴) ایضاً ، ص ۲۳ -

(۵) ایضاً ، ص ۲۴ - ۲۵ -

(۶) کتاب الموافقات، قاهره سنه ۱۳۰۲ھ، ج ۱، المقدمہ الخامسہ -

(۷) ایضاً ، المقدمہ الثالثہ -

(۸) ایضاً ، ج ۱، ص ۲۰ - ج ۲ ص ۴۱ - ۵۶ میں اس کی مزید تشریح و تفصیل درج ہے -

(۹) ماهنامه "فکر و نظر" بابت جون سنه ۱۹۶۴ء، ص - ۱۷ - ۱۸ -

(۱۰) مکتوبات مجدد الف ثانی، دفتر اول، مکتوب نمبر ۲۶۶ -

(۱۱) مجموعہ الرسائل الکبری، قاهره ، سنه ۱۳۲۳ھ، ج ۱ (فی الامر والاراده)، ص ۳۶۱-۳۶۲ -

(۱۲) شرح المواقف مع حاشیه سیالکوٹی و چلپی، مصر، سنه ۱۳۲۵ ھ، ج ۱، ص ۵۱ -

(۱۳) ایضاً ، ص ۳۶ -

(۱۴) مزید تفصیل کے لئے ملاحظه هو میری زیر اشاعت کتاب "اسلام" (انگریزی) کا باب به عنوان "Education" -

اُطلبوا العلم من المهد الى اللحد